تحریر: پروفیسر ڈاکٹر سید حسین ایم جعفری

ترجمہ: اشفاق انور

تقویٰ ـــــ قرآن مجید کی روشنی میں

اس مقالے کا موضوع قرآن مجید کی تخصیص اور آفاقیت پر، خاص کر لفظ "تقویٰ" کے حوالے سے مختصر بحث کرنا ہے، جو قرآنی اخلاقیات میں کلیدی حیثیت کی اصطلاح ہے۔ زیر نظر اصطلاح ایک عربی لفظ ہے، اور یہ حقیقت اسے ایک خصوصی مفہوم عطا کرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن مجید میں اس لفظ کو جس مقصد اور معنی میں استعمال کیا گیا ہے، وہ اس کو تخصیص کی سطح سے اُٹھا کر آفاقی موزونیت کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ تاہم اصطلاح "تقویٰ" کے معنی اور محلِ استعمال پر بحث کرنے سے پہلے چند عمومی نکات کا تذکرہ مفید ہوگا۔

کوئی بھی معاشرتی، سیاسی یا دینی تحریک اپنے عمرانیاتی سیاق و سباق میں کسی معاشرے کے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتی، اور نہ کوئی ابلاغ اپنے لسانیاتی ڈھانچے میں کسی زبان کے بغیر مکمل ہو سکتا ہے۔ معاشرے، جیسا کہ ہم انھیں تسلیم کرتے ہیں، اپنے تاریخی سیاق و سباق کے ساتھ ہی قابلِ شناخت ہوتے ہیں، اور زبانیں، جیسا کہ ہم انھیں سمجھتے ہیں، اپنی مفہومی خصوصیات کی بدولت قابلِ فہم ہوتی ہیں۔ زبان ہر معاشرے میں ذریعۂ ابلاغ کا اہم کردار ادا کرتی ہے، اور کسی زبان کی تمام علامتیں، تشبیہیں اور استعارے لازماً اُسی ماحول، معاشرتی نظام اور ثقافتی قالب کی پیداوار ہوتے ہیں جہاں وہ زبان استعمال کی جاتی ہے۔ معاشرے اور زبان دونوں کی اسی ناگزیر فطرت سے ہی اُن کے اظہارات اور موضوعات کو تخصیص ملتی ہے۔

ایسے ہی کوئی بھی پیغمبر کسی خلا میں اپنا فریضہ انجام نہیں دے سکتا، اور نہ کسی وحیِ الٰہی کا ابلاغ زبان کے بغیر ممکن ہے۔ اور زبان بھی لازماً وہی ہوگی جو اُن لوگوں کی سمجھ میں

آسکے جن کو پیغام دیا جانا ہو۔ اس طرح جتنے بھی پیغمبر آئے، اُنھیں اللہ تعالیٰ نے بلا استثنا انہی لوگوں میں سے منتخب اور مبعوث کیا۔ اس بات کو قرآن مجید میں بڑے واضح انداز میں یوں بیان کیا گیا ہے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ط (سورۃ ابراہیم ۴)

(ترجمہ) اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ، تاکہ وہ انھیں بخوبی سمجھا سکے۔

قرآن مجید اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ جس طرح لوگ اس تخلیق، خدوخال اور رنگت کے لحاظ سے مختلف ہیں، اسی طرح اُن کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ط

(سورۃ الروم: ۲۲)

(ترجمہ) اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق، اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا نوع بہ نوع ہونا۔

لہٰذا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل کی گئی، وہ سلیس عربی زبان میں تھی، جیسا کہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے:

وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (سورۃ النحل: ۱۰۳)

(ترجمہ) اور یہ واضح (صاف) عربی زبان ہے۔

جس طرح یہودیوں کے لیے عہد نامۂ قدیم (تورات) میں عبرانی زبان کو ذریعۂ ابلاغ کے طور پر منتخب کیا گیا، اسی طرح قرآن مجید کے لیے عربی زبان کو اختیار کیا گیا۔ اس دلیل کو سورۃ الزخرف میں مزید واضح کیا گیا ہے:

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورۃ الزخرف: ۳)

(ترجمہ) بے شک ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم بخوبی سمجھو۔

عربیت کے علاوہ قرآن مجید کی تخصیص کا ایک اور اہم پہلو، جس سے تغافل برتا نہیں جا سکتا یہ ہے کہ بہت سی قرآنی آیات اُن مخصوص واقعات اور فوری نوعیت کے مسائل

کا احاطہ کرتی ہیں جو آں حضرتؐ کو اپنے روزمرّہ معاملات میں پیش آئے۔ وحی کے ان مواقع یا حالات کو متأخرین نے اسلامی نظریاتی کتابوں میں "اسباب النزول" کہا ہے۔ بہت سے مفسرین خصوصاً الطبری اور الرازی نے متعلقہ قرآنی آیات کے ٹھیک ٹھیک معانی اور سیاق و سباق کی تشریح کی غرض سے ایسے مواقع کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ اس موضوع پر اور بہت سی کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں سب سے معروف اور معیاری کتاب الواحدی کی تصنیف ہے جس کا تکملہ السیوطی نے "لباب النقول فی اسباب النزول" کے نام سے لکھا۔ تاہم یہ امرِ واقعہ کہ قرآن مجید کا خاصا بڑا حصّہ آں حضرتؐ کے عہد کے مخصوص واقعات اور انسانی کارگزاریوں سے تعلق رکھتا ہے، اس الہامی کتاب کو ایک خاص تاریخی سیاق و سباق کا حامل بناتا ہے۔

جیسا کہ پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے، قرآن مجید نے ان دونوں حقیقتوں کو اپنی تخصیص کے پیشِ نظر تسلیم تو کیا ہے، لیکن اس کے باوجود خدائی آفاقیت اور انسانی تخصیص کے باہمی تعلق پر بار بار زور دیا ہے۔ کوئی بھی عالم گیر مثالی تصور تجریدی انداز میں نہیں سکھایا جا سکتا؛ بلکہ ضروری ہے کہ یہ فرد اور معاشرے کے باہمی حوالے سے مخصوص اور محسوس شے میں سے وجود پذیر ہو۔ تاہم جو بات اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ آیا کسی مخصوص شے میں اس امر کی پیدائشی گنجائش یا صلاحیت ہے کہ اسے مخصوص سے ماورا حد تک منطبق کیا جا سکے، اور کسی محسوس کو زمان و مکان اور انسانی حدود کے علاوہ تاریخی سیاق و سباق کا لحاظ کیے بغیر آفاقی کی سطح تک پہنچایا جا سکے۔ قرآن مجید کی کئی آیات میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ آں حضرتؐ کے ذریعے بھیجا گیا پیغام اگرچہ عربی زبان میں ہے، لیکن یہ صرف عربوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ تمام بنی نوع انسان کے افادے کے لیے ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ سبا: ۲۸)

(ترجمہ) اور ہم نے تمھیں تمام انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (سورۃ الاعراف : ۱۵۸)

(ترجمہ) کہہ دو، اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

قرآنِ مجید کے اس دعوے کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی غرض سے کوئی اسے کس طرح جانچ سکتا ہے؟ علاوہ ازیں قرآن مجید کے بنیادی پیغام اور اس کے دعوائے آفاقیت جیسے بہت سے پہلوؤں کو بھی جانچا جا سکتا ہے اور اس کے لیے اخلاقیات کی کلیدی اصطلاحات اور ان کے نیم مفاہیم کے بغور مطالعے کی ضرورت ہے اور اس میں دورِ جاہلیت کے عربوں کے ہاں ان الفاظ کے مروّجہ معانی سے تقابل بھی شامل ہے۔ احسان، صدق، برّ، عدل، تقویٰ جیسی اصطلاحات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ پروفیسر ٹی ایزوتسو (IZUTSU) نے اپنی دو فاضلانہ کتابوں میں اس طرح کی بہت سی اصطلاحات کا مفکرانہ اور عمیق جائزہ لیا ہے[۱] لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر زیرِ غور الفاظ کی مفہومیاتی ساخت پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ قرآن مجید واقعتہً عربی ہے اور اس میں عربی زبان کا ذخیرۂ الفاظ ہی استعمال کیا گیا ہے لیکن اکثر موقعوں پر ان کلیدی الفاظ کے لُغوی معانی میں التزاماً ترمیم کی گئی ہے بلکہ ان کے مضمر مفاہیم بھی بدل دیے گئے ہیں تاکہ وہ اسلامی اخلاقیات کے نئے ضوابط کی نمائندگی کر سکیں۔

تاہم ایسا لگتا ہے کہ قرآن مجید میں مستعمل تمام اخلاقیاتی اصطلاحات میں سب سے زیادہ جامع اور مثالی انسانی کردار کی غالباً سب سے زیادہ نمائندہ اصطلاح "تقویٰ" ہے جس کو میں یہاں لغوی معنوں میں نہیں، بلکہ اس کے وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے زیرِ بحث لانا پسند کروں گا جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد انسانی مواقع پر اسے استعمال کیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید کے اکثر انگریزی مترجمین "تقویٰ" کا ترجمہ عموماً Fear یعنی "ڈرنا" کرتے ہیں، اور اسی لیے لفظ "متقی" کو خدا سے ڈرنے والا یا پارسا آدمی لکھتے ہیں۔ لہٰذا اس اصطلاح کو عام طور پر قرآن مجید کا ایک اعتقادی تصوّر سمجھا جاتا ہے، یعنی قیامت کے دن اور اُس دن کے مالک سے ڈرتے رہنا[۲] اسے بعض آیات میں پائے جانے والے مفاہیم میں سے ایک مفہوم تو سمجھا جا سکتا ہے، لیکن اس سے ایک مثالی انسان کا وہ تصوّر متشکل نہیں ہوتا جو

قرآن مجید کی اس اصطلاح کے ذریعے پیش کیا جانا مقصود ہے۔

اصطلاح تقویٰ کا مادہ " و ق ی " (وقیٰ) اور وقایہ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کے خلاف حفاظتی اقدام یا تحفّظ کرنا، یا کسی چیز کی نگہداشت کرنا اور اسے محفوظ رکھنا[۳] قرآن مجید کے نامور مفسّرین میں الزمخشری کا نام قابلِ ذکر ہے۔ وہ عموماً عربی الفاظ کے وہ اصلی معانی دیتے ہیں جو قبل اسلام کے دور میں استعمال ہوتے تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ واقٍ (واقی) اس گھوڑے کو کہا جاتا تھا جو سخت ناہموار یا پتھریلی زمین پر احتیاط سے چلتا ہے کہ کہیں اس کے سُم زخمی نہ ہو جائیں[۴] اس طرح مادہ "وقیٰ" اور "وقایہ" کا مطلب ہوا کسی چیز کی نگہداشت کرنا یا کسی مُضر اور نقصان رساں چیز سے اپنا تحفّظ کرنا۔ وقیٰ سے باب پنجم میں " اتّقیٰ " کی تشکیل ہوتی ہے جس کا مطلب ہے " اس نے کسی چیز سے اپنا خوب تحفّظ کیا یا خود کو اچھی طرح محفوظ رکھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ قبل اسلام کے عرب شعرا اس فعل کے مختلف صیغوں کو اپنی شاعری میں بکثرت استعمال کرتے رہے ہیں۔ زُہیر بن ابی سلمہ یوں کہتا ہے:

وَقَالَ سَأَقْضِي حَاجَتِي ثُمَّ اتَّقِي
عَدُوِّي بِأَلْفٍ مِن وَرَائِي مُلْجَمِ

(ترجمہ) اُس نے اپنے آپ سے کہا کہ میں پہلے اپنی خواہش پوری کروں گا، اور پھر ایک ہزار آراستہ گھوڑوں کی مدد سے اپنا تحفّظ کروں گا[۵]

اسی معلّقے میں وہ پھر اس لفظ کو یوں استعمال کرتا ہے:

وَمَن يَجْعَلِ الْمَعْرُوفَ مِن دُونِ عِرْضِهِ
يَفِرْهُ وَمَن لَا يَتَّقِ الشَّتْمَ يُشْتَمِ

(ترجمہ) جو کوئی فیض رسانی کو اپنی نیک نامی کے لیے ڈھال بناتا ہے، اس کی عزت افزائی ہوتی ہے اور جو کوئی دوسروں کو گالیاں دینے سے اجتناب نہیں کرتا، وہ جواب میں گالیاں ہی سُنے گا (یعنی جو بُرے برتاؤ سے اپنا تحفّظ نہیں کرے گا، دوسرے بھی اُس سے بُرا برتاؤ ہی کریں گے)[۶]

"تاج العروس" کے حوالے سے ایک اور شاعر خفّاف السُّلامی کا ایک شعر یوں ہے :

جَلَاهَا الصَّيقَلُوْنَ فَأَخْلَصُوهَا
خِفَافاً كُلُّهَا يَتَّقِي بِأَثْرِ

(ترجمہ) چمکانے والوں نے اُن کو چمکا کر داغ دھبّے دُور کر دیے اور اب اس چمک دمک نے ہر ایک کو نظرِ بد سے محفوظ کر دیا ہے ۷ؔ

معلّقات کا ایک اور مشہور شاعر عمرو بن کلثوم اس لفظ کو یوں استعمال کرتا ہے :

نَجُذُّ رُؤُسَهُم فِي غَيْرِ بِرٍّ
فَمَا يَدرُوْنَ مَاذَا يَتَّقُوْنَا

(ترجمہ) جب ہم نے اُن کے سر بیدردی سے کاٹ دیے، تو وہ ہم سے اپنا بچاؤ کرنے کے قابل نہ رہے ۸ؔ

قبل اسلام کی طول طویل شاعری میں سے یہ محض چند نمونے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں کے ہاں لفظ "اتّقاء" اسی عام مفہوم میں بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ عربی ادبیات کے مستند دانشور طبریزی نے دیوان الحماسہ کی شرح میں اس اصطلاح کے بارے میں لکھا ہے :

اَلْاِتِّقَاءُ اَنْ تَجعَلَ بَینَكَ وَبَیْنَ الَّذِي تَخَافُهُ حَاجِزاً يَحْفَظُكَ

(ترجمہ) "اِتّقاء" کا مطلب ہے خود اپنے اور اُس چیز کے مابین کوئی مدافعتی آڑ یا حفاظتی پردہ حائل کرنا جس سے آپ خائف ہوں تاکہ آپ اس خطرے سے محفوظ رہیں ۹ؔ

ان چند مثالوں سے، جن کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے، یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ عہدِ جاہلیت میں لفظ "اِتّقاء" کے ساتھ کوئی مذہبی یا اخلاقی تصوّر وابستہ نہ تھا۔ یہ قرآن مجید ہی ہے جس میں پہلی بار اس لفظ کے مفہوم میں ترمیم کر کے، اور اسے ایک سادہ اور عام استعمال کی سطح سے اُٹھا کر، انسانی زندگی کی جامع اور معیاری اخلاقی اقدار کا حامل لفظ بنایا گیا۔

قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے مختلف مشتقات اور اسم فاعل "متقی" (جمع متّقون)

اور مصدر "تقویٰ" سمیت ۲۴۲ بار، یعنی ۱۰۲ بار مکی سورتوں میں، اور ۱۴۰ بار مدنی سورتوں میں استعمال ہوا ہے۔

نزولِ وحی کے بارے میں قرآن مجید کی بعض سورتوں اور آیتوں کی تاریخ وار ترتیب کا تعیّن پورے وثوق سے نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کچھ آیات کی تقدیم و تاخیر کے سلسلے میں مختلف رائیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود مکی اور مدنی ادوار کی سورتوں اور آیتوں کے متعلق شاید ہی کوئی نمایاں اختلاف ہو سکتا ہو۔ اگر کہیں ایسا ہوا ہے کہ مدنی سورتوں میں مکی آیات یا مکی سورتوں میں مدنی آیات آگئی ہیں تو قرآن مجید کے مفسرین نے بڑی احتیاط سے ان کی نشاندہی کر دی ہے۔ تاہم اس بات پر تقریباً سبھی متفق ہیں، یا کم از کم مسلم شارحین کی رائے یہی ہے کہ سورت العلق، جو قرآن مجید کی سورت نمبر ۹۶ ہے، سب سے پہلی وحی ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ البتہ بعض مغربی دانشور یہ سمجھتے ہیں کہ اس سورت کی پہلی ۹ آیتیں ہی اوّلین وحی ہیں جب کہ باقی آیتیں بعد میں نازل ہوئی تھیں۔ بہرحال یہی وہ سورت ہے جس میں پہلی بار لفظ "تقویٰ" متعارف کرایا گیا۔ آیات ۹ تا ۱۲ ملاحظہ ہوں:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ؕ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۙ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ؕ

(ترجمہ) کیا تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے جو منع کرتا ہے (اللہ کے) بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر ہے، یا تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اگر بالفرض ہم سورۃ العلق کو اولین سورت تسلیم نہ کریں، تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ لفظ "تقویٰ" سب سے پہلے اسی سورت میں استعمال ہوا ہے، کیونکہ دوسری تمام سورتیں جن کے بارے میں پہلی وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے، مثلاً ولیم میور کی مجوزہ ترتیب میں سورۃ العصر اور گرم (GRIMME) کی مجوزہ ترتیب میں سورۃ ابی لہب وغیرہ، اُن میں یہ اصطلاح یا اس کا کوئی مشتق لفظ استعمال نہیں ہوا۔ لہٰذا اس کے متعلق چند

اہم نکات یہاں پیش کیے جاتے ہیں - پہلی بات یہ ہے کہ زیرِ بحث لفظ سب سے پہلے اپنی مصدری حالت میں استعمال ہوا ہے، نہ کہ فعل کی صورت میں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو ایک مخصوص وصف یا طرزِ عمل کی تعبیر کے لیے ایک معیّنہ اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے - دوم یہ کہ اس وقت جب کہ دو بہت ہی بنیادی نوعیت کی اصطلاحیں "ایمان" اور "اسلام" ابھی قرآن مجید میں متعارف نہیں ہوئی تھیں، یعنی نزولِ وحی کے بالکل آغاز ہی میں اصطلاح "تقویٰ" کو انسانی طرزِ عمل کے قرآنی تصورات کی نمائندگی کے لیے منتخب کر لیا گیا - سوم یہ کہ اس کو محض اعتقادی مفہوم میں بار بار استعمال نہیں کیا گیا کیونکہ اس کو انسانی کردار کی بنیادی خصوصیت کے طور پر نمایاں کرنا مطلوب تھا - اور آخر میں یہ اہم نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اصطلاح "تقویٰ" کو قرآن مجید کی ایک اور اصطلاح "ہُدیٰ" یعنی راہِ راست کے متبادل یا مترادف کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ مذکورہ سورت کی آیات ۱۱-۱۲ میں لکھا ہے:

اَرَءَيۡتَ اِنۡ كَانَ عَلَى الۡهُدٰٓى ۙ اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰى ؕ (سورۃ العلق۔ آیات ۱۱،۱۲)

(ترجمہ) کیا تم نے اسے دیکھا ہے کہ وہ راہِ راست پر ہے، یا تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

سب سے پہلی وحی میں، یا کم از کم ابتدائی سورتوں ہی میں لفظ "تقویٰ" کو ایک بنیادی اخلاقیاتی اصطلاح کے طور پر متعارف کرانے کے بعد قرآن مجید میں اسے بہت سے موقعوں پر اور مختلف انسانی معاملات کے حوالوں سے اسمِ فاعل کی صورت میں (یعنی متقی جمع متقون) اور متعدد فعلی حالتوں اور صیغوں میں بھی (یعنی ماضی، حال، واحد اور جمع) کے طور پر استعمال کیا گیا ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مقامات پر یہ لفظ قرآن مجید کے اعتقادی نظریے کی نمائندگی بھی کرتا ہے جو انسان کے ضدّی رویّے کا منطقی حل اور دینی شعور کا لازمی پہلو ہے۔ لیکن عمومی طور پر نزولِ وحی کے ابتدائی مکّی یا مؤخر مدنی ادوار میں اس اصطلاح کو محض "خوفِ خدا" یا اخلاقیات کے اعتقادی تناظر کی نسبت زیادہ وسیع مفہوم میں پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں بعد میں تشریح کروں گا یہ اصطلاح انسان کے رویّے اور طرزِ عمل کے علاوہ اس کے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے احساس کا ہمہ گیر اور جامع مفہوم بھی رکھتی ہے۔ دوسرے

لفظوں میں قرآن مجید نے تقویٰ کی صفت کو اپنی تعلیمات کا مرکز و محور قرار دیا اور مثالی اخلاقیات کے آفاقی اور قابلِ عمل معیار کے قرآنی تصوّر کا ملخص پیش کیا ہے۔ اس نکتے کو چند ایسی مثالوں سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جہاں لفظ "تقویٰ" کو انسانی کردار کے مذموم پہلوؤں کے مقابل پیش کیا گیا ہے، یا جہاں متضاد صفات ظاہر کرنے والی اصطلاحات کے ساتھ تقویٰ کا موازنہ کیا گیا ہے۔ غالباً یہ بھی "تقویٰ" کے معنی سمجھنے کا ایک بہتر طریقہ ہے۔ بصورتِ دیگر کسی اور زبان میں اس اصطلاح کا ترجمہ کرتے وقت ٹھیک ٹھیک مفہوم ادا کرنے والا لفظ تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ تصوّری مفہوم کی حامل اصطلاحات کا ترجمہ کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے، تاہم اس مختصر مقالے میں متخالف یا موازنے کی تمام نظیروں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میں اُن میں سے محض چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

سورۃ اللیل یقیناً ابتدائی مکّی سورتوں میں سے ایک ہے۔ اس کی آیات ۴ تا ۱۰ ملاحظہ ہوں:

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۝ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۝ (اللیل-۴-۱۰)

(ترجمہ) بے شک تم لوگوں کی تگ و دو مختلف (مقاصد کے لیے) ہوتی ہے، تو جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور نیکوکاری اختیار کی، اور نیک بات کو خلوص سے سچ جانا، اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے۔ اور جس نے بُخل سے کام لیا اور خود کو دوسروں سے بے نیاز سمجھا اور نیک بات کو رد کیا تو ہم اسے ابتلا کی طرف پہنچائیں گے۔

اب یہاں دو اچھی، یا یوں کہیے کہ مثبت صفات اور دو بُری یا منفی صفات بالکل ایک دوسرے کے مقابل دی گئی ہیں، یعنی "أَعْطَىٰ" (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) کے بالمقابل "بَخِلَ" (کنجوسی کرنا)، اور "اِتَّقَىٰ" (جس کو میں ابھی عملِ صالح لکھتا ہوں) کے مقابلے میں "اِسْتَغْنَىٰ" (بے پروا یا غنی ہونا)۔ گویا "اِتّقاء" اور "اِستغناء" کو یہاں ایک دوسرے

کا متضاد کہا گیا ہے۔ لفظ "استغناء" یہاں انسان اور اللہ تعالیٰ کے حوالے سے جس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اس سے انسان کے خود کفیل ہونے کا احساسِ تفاخر ٹپکتا ہے، لیکن درحقیقت اس سے خود مرکزیت اور غرور مراد ہے جو تکبّر کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور جس سے انسان کی بالاتر حاکمیت کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی سے مکمل بے التفاتی مترشح ہوتی ہے۔ اور جب وہ کسی اعلیٰ تر ہستی کے آگے جواب دہ نہ ہو اور اس کے اعمال کا محاسبہ بھی نہ کیا جائے تو پھر وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے جو بھی چاہے کر سکتا ہے۔ گویا لفظ "استغناء" سے انسان کا جو رویّہ متشکل ہوتا ہے، اس کے متخالف طرزِ عمل سے ہی ہم لفظ "اتّقاء" کے معانی کا ادراک کر سکتے ہیں، یعنی انسان کا وہ شعور جو اسے اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے اپنے تفکّر اور اپنے اعمال سے متعلقہ اپنی ذمہ داریاں یاد دلاتا رہے۔

سورۃ الشمس بھی ابتدائی مکّی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (سورۃ الشمس: ۷ تا ۱۰)

(ترجمہ) قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اُس کی جس نے اس کو ٹھیک بنایا۔ پھر اس (کے دل) میں بدی اور نیکوکاری کی خاصیت رکھی۔ تو جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا، اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ نامراد رہا۔

یہاں فجورؔ اور تقویٰ کی اصطلاحیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد معنوں میں استعمال ہوئی ہیں، اور قرآن مجید میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسانی روح کو تخلیق کرتے وقت اس میں فجورؔ اور تقویٰ دونوں صلاحیتیں رکھی ہیں۔ "فجور" کا بنیادی مفہوم کجروی ہے اور استعارۃً اس سے مراد ہے "راہِ راست سے ہٹنا یا انحراف کرنا" اور پھر کوئی غیر اخلاقی فعل انجام دینا۔ اس طرح فجور کو بدطینتی، ناپاکی اور غلط کاری کے معنوں میں، اور "فاجر" (جمع فُجّار) کو گناہگار یا ہٹ دھرمی سے اخلاقی اقدار کی خلاف ورزی کرنے والے کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ بہت سی آیات میں فجورؔ کو کفر کے ہم معنی اور فاجر کو کافر کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے،

مثلاً سورۃ نوح، آیات ۲۷ و ۲۸ اور سورۃ عبس، آیات ۳۸ تا ۴۲ میں۔ گویا فجور انسان کی وہ منفی صلاحیت ہے کہ اگر اس کو قابو میں نہ رکھا جائے تو انسان کے گناہ اسے کفر کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس تقویٰ انسانی شعور کی وہ مثبت صلاحیت ہے جو اسے تباہ ہونے سے محفوظ رکھتی یا اس کا تحفظ کرتی ہے۔

"ظلم" ایک اور بُرا فعل ہے اور اس لفظ کا بنیادی مفہوم جبر و استبداد ہے۔ یہ بھی قرآنی اخلاقیات میں ایک بڑے گناہ کے طور پر مذکور ہے، اور لفظ "ظالم" (اسم فاعل) سے جابر، عاصی یا مستبد مراد ہے۔ قرآن مجید میں اس کی بڑی مذمت کی گئی ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ظلم اور تقویٰ، یا ظالم اور متقی کی اصطلاحات ایک دوسرے کی ضد کے طور پر دی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ الجاثیہ میں فرمایا گیا ہے:

وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝

(سورۃ الجاثیہ: ۱۹)

(ترجمہ) اور بے شک ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دوست ہے جو پارسا، فرض شناس اور خدا ترس ہیں۔

سورۃ المائدہ درمیانی مدنی دور کی سورت ہے۔ اس میں ایک ایسی آیت ہے جو انسانی کردار کے متخالف پہلوؤں کے مقابلے میں تقویٰ کے اخلاقیاتی تصوّر کو بڑی عمدگی سے نمایاں کرتی ہے۔ مذکورہ آیت اس طرح ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (سورۃ المائدہ: ۲)

(ترجمہ) اور نیکی اور پارسائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔ اور گناہ اور زیادتی میں مدد نہ کیا کرو۔ اور اللہ سے باخبر رہو (عام ترجمہ: ڈرتے رہو)۔ بے شک اللہ سزا دینے میں سخت گیر ہے۔

لفظ "برّ" جو قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے، اور جس کا ترجمہ عموماً نیکی، پاکبازی اور رحمدلی وغیرہ کیا جاتا ہے، یہاں اسے تقویٰ کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا

ہے۔ اسی طرح "برّ" کا متضاد "اِثم" (گناہ) دیا گیا ہے اور تقویٰ کی ضد "عُدوان" (زیادتی یا جارحیت) ہے۔ یہ آیت اُن بہت سی آیات میں سے ایک ہے جہاں لفظ "تقویٰ" اپنے وسیع اور موزوں معنوں میں لفظ "برّ" کے ساتھ آیا ہے جو انسانی کردار کی نسل، رنگت، عہد اور مذہب کا لحاظ کیے بغیر اتنی ہی آفاقی اور متوازن صفت ہے۔ اس آیت میں انسانی رویّے کی مثبت اور منفی صفات کو ایک دوسرے کے بالمقابل رکھا گیا ہے یعنی ایک طرف برّ اور تقویٰ اور دوسری طرف اِثم اور عُدوان۔ اور پھر ان صفات کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، وہ ان کی موزونیت کو بے حد عمومی اور آفاقی بنا دیتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد یا تعاون کا جو معیار پیش کیا گیا ہے، وہ کسی مخصوص برادری یا کسی مذہبی، قومی، قبائلی، جغرافیائی، سماجی، ثقافتی، نسلی یا اقتصادی تعلقات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اُن عمومی اور اخلاقی اقدار سے تعلق رکھتا ہے جو تمام انسانی معاملات کی صورتوں میں ہمہ گیر اور آفاقی لحاظ سے موزونیت کی حامل ہیں۔

تاہم قرآن مجید تمام بنی نوع انسان کو اُن کے رویّوں اور طرزِ عمل کی بنیاد پر تین مختلف زُمروں میں تقسیم کرتا ہے، یعنی عالمگیر اخلاقی صفات پر مبنی قرآنی فلسفے کی رو سے انسانوں کے تین بڑے گروہ ہیں: مُتّقُون، کافِرُون اور مُنافِقُون۔ مُتّقون اس میزان کی ایک جانب ہیں اور کُفّار دوسری جانب، جب کہ مُنافِقون ان دونوں کے درمیان معلّق ہیں۔ انسانی معاشرے کی یہ درجہ بندی سارے قرآن مجید میں بڑی نمایاں اور واضح انداز میں بیان کی گئی ہے۔ مگر میں یہاں سورۃ البقرہ کی محض چند ابتدائی آیات کا حوالہ دوں گا جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے ان گروہوں کی کیا پہچان بتائی ہے۔ آیات ۲ تا ۴ میں مُتّقُون کی تعریف اس طرح بیان ہوئی ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۭ (سورۃ البقرہ: ۲ تا ۴)

(ترجمہ) یہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں، اُن لوگوں کی رہنما ہے (۱) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، (۲) اور نماز قائم کرتے ہیں، (۳) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں، (۴) اور جو کچھ (اے محمدؐ) تم پر نازل کیا گیا اور جو کچھ تم سے پہلے نازل کیا گیا، سب پہ ایمان لاتے ہیں، (۵) اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔

یہ ہیں مُتّقوُں کی پانچ بڑی صفات جن کو یہاں عمومی اصطلات میں بیان کیا گیا ہے۔

اَن دیکھے خدا پر ایمان لانا جس کی بار بار تاکید کی گئی ہے، اور جو مُتقی ہونے کی سب سے پہلی اور اہم ترین شرط ہے، قرآن مجید کا بنیادی اصولِ موضوعہ ہے اور اس کی آفاقیت کے اثبات میں بڑی اہمیت کا حامل بھی ہے۔ اس اَن دیکھے خدا پر ایمان لانے کا مقصد ہے انسانوں کو ہر قسم کی تخصیص سے اور ہر طرح کے بندھنوں اور بندشوں سے آزاد کرنا۔ قرآن مجید انسان کو واقعیت سے تصوّریت کی سطح تک اُٹھانا چاہتا ہے، اور جو محض تصوّر پر مبنی ہو، وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے ہمیشہ اَن دیکھا ہی رہتا ہے۔ ایک مکمل ادراک شدہ معبود کبھی معبود نہیں ہوتا، اور ایک مکمل واقعیت کا حامل تصوّر کوئی تصوّر نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کو تمام تصوّرات کا اَن دیکھا منبع قرار دینے سے انسانی زندگی ارتقا پذیر اور متحرک ہو جاتی ہے۔ روح کی پیش رفت دیکھے سے اَن دیکھے کی طرف، خارجی سے داخلی کی جانب، اور ظاہری حالت سے حقیقت کی سمت میں ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ مُتقی وہ ہوتا ہے جو یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ " اللہ تعالیٰ قریب سے قریب ترین ہے اور ماورا سے ماورا ہے۔" کوئی بھی شخص معبودِ حقیقی کا اس کے جوہر میں مکمل ادراک نہیں کر سکتا۔ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی جلوہ نمائی ہے، مگر " کوئی شے اس جیسی نہیں ہے۔" اس سے متعلق تمام تشبیہات نا تمام ہیں۔

اے برون از وہم و قال و قیلِ من
خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من!

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (النّور - ۳۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ آسمانوں کا اور زمین کا نور ہے۔

اور یہ کہ اس کا نُور خود افروز اور لامکانی ہے۔ مشرق اور مغرب اُسی کے ہیں مگر اس کا نور نہ شرقی ہے، نہ غربی۔ وہ اپنی ہستی کو فطری اور خُلقی نظم کے، جمال کے، ضمیر کے، اور مودّت کے رُوپوں میں جلوہ نما کرتا ہے۔ وہ تمام دانش، تمام قوّت، اور تمام خیر کا مثالی تصوّر ہے، لیکن کوئی تصوّر بھی کاملاً واقعیتی نہیں ہوتا۔ یہ اسی تصوراتی مفہوم کی بات ہے کہ اس کی عظیم اَن دیکھی ہستی کو تسلیم کرکے ہی اس کی پرستش کی جاتی ہے، اگرچہ وہ تمام نظر آنے والی اشیا کا سرچشمہ ہے۔ اور اس طرح مُتّقی کے لیے ایک اَن دیکھے معبود حقیقی پر اعتقاد رکھنا ہی سب سے پہلی اور لازمی شرط ہے۔ یہ محض ایک عقیدہ نہیں، بلکہ ایک بنیادی ضرورت ہے کہ انسان کو ہر طرح کی تنگ نظری اور تعصّب سے بچایا جائے اور اسے تخصیص سے اُٹھا کر آفاقیت کی سطح پر لایا جائے۔

ایک مُتّقی کے لیے بقایا چار شرطیں جو بیان ہوئی ہیں، یعنی روح کی پاکیزگی کے لیے نماز، بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے خیرات، حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیا پر نازل شدہ وحی کا اعتراف اور آخرت پر یقین جو اس دنیوی زندگی کو ایک مقصد اور معنی عطا کرکے انسان کو اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کا شعور بخشتا ہے، اور یہ تمام باتیں اللہ پر اعتقاد کا بدیہی حاصل ہیں۔ یہ پانچ صفات اپنے وسیع مفہوم میں اختیار کر لی جائیں تو انسان "متقون" کہلانے کے حقدار اور کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں:

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (سورۃ البقرہ: ۵)

(ترجمہ) اور وہی لوگ ہیں جو کامیاب (یا بامُراد) ہوتے ہیں:

ان صفات کی آفاقی موزونیت کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن یہاں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ رسول اکرمؐ سے پہلے کے تمام انبیا کو بھی ماننے کی ضرورت پر میں خصوصی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا جس کے بغیر کوئی شخص متقی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید کے یہ الفاظ:

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج (البقرہ: ۴)

(ترجمہ) اور جو کچھ (اے محمدؐ) تم سے پہلے نازل کیا گیا)۔

دُنیا کی تمام قوموں کے نام نازل کردہ وحی (الہامی کتب) کا احاطہ کرتے ہیں، چنانچہ ایک اور جگہ ہمیں بتایا گیا ہے:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ (سورۃ فاطر: ۲۴)

(ترجمہ) کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس میں کوئی تنبیہ کرنے والا نہ بھیجا گیا ہو۔

تاہم قرآن مجید میں ان سب نبیوں (اور رسولوں) کے نام درج نہیں ہیں، ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ط (سورۃ المؤمن: ۷۸)

(ترجمہ) اور ہم نے جو رسول بھیجے ہیں، اُن میں سے بعض کا ذکر تم سے کیا ہے، اور بعض اور بھی ہیں جن کا ہم نے تم سے ذکر نہیں کیا۔

لہٰذا ایک متقی کے لیے لازم ہے کہ وہ نہ صرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی شدہ کلام الٰہی پر ایمان لائے بلکہ پوری انسانیت کے نام یعنی تمام اقوام عالم کے لیے وحی الٰہی پر بھی ایمان رکھتا ہو۔

"مُتَّقُوْن" کے بالکل برعکس جن لوگوں کا نام لیا گیا ہے، وہ "کافِرُوْن" کا گروہ ہے جن کا ذکر ان کے فوراً بعد آتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (البقرہ - ۶)

(ترجمہ) جو لوگ ایمان نہیں لائے (یعنی اسلام سے انکار کرتے ہیں) ان کے لیے برابر ہے کہ تم ان کو تنبیہ کرو، یا نہ کرو۔ وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔

قرآن یہاں "کفار" کی ویسی ہی مکمل تفصیل بیان نہیں کرتا جیسی کہ "مُتَّقُوْن" کے سلسلے میں کی گئی ہے۔ اس کی بڑی صاف اور سیدھی وجہ ہے کہ موانے کے منطقی

قاعدے سے کفار کی خصوصیات عین اُن صفات کے برعکس ہوں گی جن کو متقوُن کے زمرے میں کھول کر بتا دیا ہے۔ لہٰذا چند الفاظ میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ کُفر، جس کا قرآن مجید میں بار بار مختلف سیاق و سباق کے ساتھ ذکر ہوا ہے، انسانی کردار اور طرزِ عمل کی تمام منفی صفات کا خلاصہ ہے جیسا کہ تقویٰ تمام مثبت صفات کا احاطہ کرتا ہے۔

تیسرا گروہ "منافقوُن" کا ہے جن کا حوالہ ان الفاظ میں آتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

(سورۃ البقرہ: ۸-۹)

(ترجمہ) لوگوں میں سے بعض ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔ لیکن وہ (دراصل) ایمان نہیں لائے۔ وہ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ مگر وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور اُنھیں اس بات کا شعور نہیں۔

یہ نفاق (یا منافقت) کی قرآنی تعریف ہے۔ لفظ "منافق" (جس کی جمع منافقوُن ہے) نفاق ہی سے مشتق ہے اور اس کا اسم فاعل ہے، جس کا مطلب ہے وہ شخص جو بظاہر زبان سے ایمان لانے کا اقرار کرے لیکن حقیقت میں دل سے ایمان نہ لایا ہو۔

قرآن پاک میں اور بھی کئی آیات ہیں جن میں منافقوں کے خصائص اور خصائل بیان کیے گئے ہیں، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ میرا مقصد محض اس نکتے کو واضح کرنا ہے کہ قرآنی درجہ بندی کے مطابق منافقوں کا گروہ نمایاں حد تک "متقوُن" کا حریف ہے۔ بہرحال اس گفتگو کا لبِ لباب یہ ہے کہ پوری انسانی دُنیا (نہ کہ صرف مُسلم اُمّت) تین مختلف زُمروں میں تقسیم کی گئی ہے یعنی مُتقّوُن، کافروُن اور منافقوُن۔

تاہم مندرجہ بالا درجہ بندی اس درجہ بندی سے قدرے مختلف ہے، جو نسبتاً زیادہ معروف ہے اور جس میں مُتقّوُن کی جگہ "مؤمنوُن" کا لفظ آتا ہے اور باقی دو گروہ وہی ہیں، کافروُن اور منافقوُن۔ ایسے ہی مثال کے طور پر فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں انسانوں کو

مؤمن، کافر، اور منافق گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "مؤمن" (یعنی ایمان سے متصف شخص) وہ ہے جس کا دل اور ضمیر دینی لحاظ سے پاک صاف ہو۔ "کافر" کی نمایاں پہچان یہ ہے کہ اپنی ہٹ دھرمی کا پکّا ہو اور ایمان لانے سے انکار کرے۔ جب کہ "منافق" وہ ہے جو ایمان لانے کا جھوٹا دعویٰ کرے مگر اس کا ضمیر اس کے خلاف ہو۔" اس میں تو کوئی شک نہیں کہ "کفر" کا متضاد لفظ "ایمان" ہے یعنی کفار ہیں جو مومنوں کا اُلٹ ہیں۔ لیکن لفظ "ایمان" بنیادی طور پر انسانی قلب کے رویّے کا اظہار ہے جو ضمیر سے تعلق رکھتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں انسان کے اندرونی رُخ سے متعلق ہوتا ہے، نہ کہ پہلے پہل اس کے اعمال اور طرزِ عمل سے، یا جس چیز کو ہم اعتقاد بالعمل کا بیرونی اظہار کہہ سکتے ہیں۔ دراصل یہی وہ نکتہ ہے جس پر میں تقویٰ کی اصطلاح اور قرآن مجید کے اخلاقیاتی ذخیرۂ الفاظ میں اس کی اہمیت پر زور دینا چاہوں گا۔

جو شخص بھی قرآن مجید پڑھتا ہے، وہ ضرور اس بات سے واقف ہوگا کہ کلام الٰہی میں "ایمان بالعمل" کی بڑی تاکید کی گئی ہے، اور اس کا مقصد ایک ایسے معاشرے کی تخلیق ہے جو دینی لحاظ سے پارسائی اور معبودِ حقیقی کے واضح تصوّر سے مملو ہو، اور جو نیکی کا حکم دے اور بدی سے منع کرے، نہ کہ وہ جو ایمان کو محض عقیدے کے طور پر اپنائے۔ قرآن مجید میں شروع سے آخر تک ہمیشہ "ایمان" اور "عملِ صالح" یعنی ایمان کے ساتھ نیکی کے کاموں کی بھی تلقین کی گئی ہے اور ایمان کا ذکر شاید ہی کہیں تنہا آیا ہو۔

ایسے ہی سورۃ العصر میں، جو یقیناً ابتدائی نازل شدہ سورتوں میں شامل ہے، یوں اعلان کیا گیا ہے:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ (سورۃ العصر: ۱ تا ۳)

(ترجمہ) قسم زمانے کی، بے شک انسان گھاٹے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور (اُنھوں نے) نیک کام کیے۔

اسی طرح سورۃ التّین میں کہا گیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ (سورۃ التین : ۴ تا ۶)

(ترجمہ) بے شک ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں پیدا کیا، پھر ہم نے اُسے نیچے گہرے گڑھے میں ڈال دیا۔ سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور (اُنھوں نے) نیک کام کیے۔

یہاں صرف دو ہی مثالیں دی گئی ہیں جب کہ سارے قرآن مجید میں جا بجا ایمان اور عمل کا ساتھ ساتھ ذکر ہوا ہے۔

اب میں اس نکتے کی طرف آتا ہوں جسے واضح کرنا مقصود ہے کہ "ایمان" انسان کی شخصیت کے اندرونی رُخ سے تعلق رکھتا ہے اور "عملِ صالح" اس کے بیرونی رُخ سے، جب کہ "تقویٰ" کی اصطلاح اکثر ان دونوں رُخوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ "ایمان اور عملِ صالح" کا مجموعی اظہار ایک طرف ہے اور محض "تقویٰ" کی اصطلاح دوسری طرف، اور قرآن مجید میں یہ دونوں اظہار باہم مبادلہ پذیر ہیں۔ اس نظریے کی واضح گواہی سورۃ البقرہ کی آیات ۲ تا ۴ سے ملتی ہے جس کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں۔ اس نکتے کو مزید اجاگر کرنے کے لیے میں دو مختلف آیات کا حوالہ دیتا ہوں۔ سورۃ البقرہ میں ہے:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی
الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَ
السَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ
اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ
صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (سورۃ البقرہ : ۱۷۷)

(ترجمہ) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا رُخ مشرق کی طرف کرو یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی اس کی ہے جو ایمان لاتا ہے اللہ پر، قیامت کے دن پر، اس کے فرشتوں اور کتاب

اور نبیوں پر، اور اللہ کی خوشنودی کے لیے مال خرچ کرتا ہے قریبی رشتہ داروں پر، اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، اور سوال کرنے والوں پر، اور قیدیوں کو آزاد کرانے کے لیے، اور نماز قائم کرتا ہے اور زکوٰۃ دیتا ہے، اور وہ جو اگر کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو اس کی پاسداری کرتے ہیں، اور وہ جو مصیبت اور پریشانی میں یا دُکھ تکلیف کے وقت صبر کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی متقین (تقویٰ کرنے والے) ہیں۔

اسی طرح سورۃ آلِ عمران میں کہا گیا ہے:

يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝

(سورۃ آل عمران: ۱۱۴-۱۱۵)

(ترجمہ) وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور قیامت کے دن پر، اور نیک کاموں کی ہدایت کرتے اور غلط کاموں سے روکتے ہیں، نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور وہ صالح (خدا ترس) لوگوں میں سے ہیں۔ اور جو اچھے کام وہ کرتے ہیں، وہ اکارت نہیں ہوں گے اور اللہ متقین کو خوب جانتا ہے۔

مذکورہ آیات بڑی واضح ہیں اور ان کی تشریح کرنے کی ضرورت نہیں، اگرچہ ان میں بہت سے آفاقی نوعیت کے نکات ہیں جو قابلِ توجہ ہیں، مثلاً مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف رُخ موڑنے کے جملے سے محض ظاہری آداب کی خاطر دین کی روح کو قربان نہ کرنے کا اشارہ ملتا ہے۔ مزید برآں لوگوں کو خیرات دینا، وعدے یا معاہدے کا پاس کرنا، نیکی کی ہدایت کرنا اور بُرے کاموں سے منع کرنا وغیرہ بڑے عام لفظوں میں مذکور ہوئے ہیں۔ تاہم ان آیات کا حوالہ دینے سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ "مُتّقُون" کی صفات میں ایمان اور عمل دونوں یکجا شامل ہیں یا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں "ایمان بالعمل" ہی ان کی پہچان ہے اور جب تک ان دونوں چیزوں پر بیک وقت عمل درآمد نہ کیا جائے، کوئی بھی شخص

متقی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

اب میں ایک اور آیت کا حوالہ دیتا ہوں جس میں جملۂ استفہامیہ کے طور پر مُتّقُون کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ سورۃ صٓ میں صرف مسلمانوں سے نہیں، بلکہ پوری انسانیت کو مخاطب کر کے پوچھا جا رہا ہے:

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ ۝ (سورہ صٓ - ۲۸)

(ترجمہ) کیا ہم اُن سے جو ایمان لائے اور (اُنھوں نے) اچھے کام کیے، ویسا ہی برتاؤ کریں گے جیسا کہ اُن سے جنھوں نے زمین میں فساد برپا کیا؟ یا کیا ہم مُتّقین سے وہی سلوک کریں گے جو فاجروں کے ساتھ ہوگا؟

صاف ظاہر ہے کہ یہاں مُتّقین کو ایمان اور عملِ صالح دونوں کے متبادل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ مفسدین کو فُجّار (یعنی فاجروں) کے مترادف کی حیثیت سے۔ اس آیت کے دوسرے جملے میں دراصل پہلے ہی جملے کے مفہوم کو واضح کرنے کی غرض سے دُہرایا گیا ہے۔ میں پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ "فجور" کے معنی بداعمالی، ناپاکی اور غلط کاری ہیں۔ فُجّار کا موازنہ یہاں مفسدین سے کیا گیا ہے یعنی بدسرشت یا وہ لوگ جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو فُجّار اور مفسدین باہم تبدّل پذیر اصطلاحات کے طور پر آئی ہیں اور دوسری طرف مُتّقین کی اصطلاح جس کا ترجمہ ہم آسانی کے لیے "فرض شناس لوگ" کر سکتے ہیں، ایمان اور عمل دونوں کے جامع متبادل کے طور پر موجود ہے۔

بہرحال اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ لفظ تقویٰ اور اس کے مشتقات کو بعض موقعوں پر کچھ خاص معنوں مثلاً تحفّظ یا ڈر وغیرہ کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ کئی موقعوں پر جہاں فعل اِتَّقُوْا (جمع اِتَّقٰی) کے ساتھ اللہ کا لفظ مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے، وہاں اس کا مطلب گہرے اعتقادی مفہوم میں خوفِ خدا یا خدا ترسی ہی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (سورۃ المائدہ: ۲)

(ترجمہ) اور اللہ سے ڈرو کہ بے شک اللہ سزا دینے میں سخت گیر ہے۔

البتہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ نزولِ وحی کے ابتدائی دور میں یہ لفظ زیادہ تر "خوفِ خدا" ہی کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا، اور پھر بتدریج اس کے معنی "خدا ترسی" ہو گئے اور آخر کار اس لفظ سے خالص اور محض "پارسائی" کا مفہوم وابستہ ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ آیت درمیانی مدنی دور سے تعلق رکھتی ہے اور تقریباً ۵ تا ۷ سنہ ہجری کے قریب نازل ہوئی، گویا رسولِ اکرمؐ کی رحلت سے ۳ تا ۵ سال پیشتر۔ تاہم بعض دوسرے موقعوں پر جب یہ لفظ "امنوا" کے بعد استعمال ہوا ہے، تو وہاں اس کے اوّلین معنی "نیکی کے کام" ہوتے ہیں۔

مثلاً:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ط (سورۃ البقرہ: ۱۰۳)

(ترجمہ) اور اگر وہ ایمان لاتے اور نیک کام کرتے تو انھیں اللہ کی طرف سے بہتر اجر ملتا۔

البتہ بعض دوسری آیات میں یہ لفظ محض اپنے لغوی معنوں میں، یعنی کسی نقصان رساں چیز سے اپنا تحفّظ کرنا یا محفوظ رہنا کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ:

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط (سورۃ الزمر: ۲۴)

(ترجمہ) پس کون ہے وہ جو قیامت کے دن اپنے آپ کو بُرے عذاب سے محفوظ رکھتا ہے؟

تاہم ان تمام معانی کے باوجود، جو حسبِ حال مختلف سیاق و سباق کے ساتھ اپنا مفہوم ادا کرتے ہیں، یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ لفظ تقویٰ اکثر اوقات ایمان اور عملِ صالح جیسی صفات کے متبادل اور جامع اظہار کے طور پر استعمال ہوا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، اللہ تعالیٰ کے عمیق اور گہرے شعور کے مفہوم میں بھی، جس کے سامنے انسان (اپنے اعمال کا) جواب دہ ہے۔

اب آخر میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ قرآن کی بیان فرمودہ تمام اخلاقیاتی اصطلاحات

میں "تقویٰ" ہی وہ اصطلاح ہے جو انسانی معاملات کی مختلف صورتوں پر محیط اور وسیع تر موزونیت کی حامل ہے اور جو بیک وقت تخصیصی بھی ہے اور آفاقی بھی! اس کا بہترین محلِ استعمال قرآن کی یہ آیت ہے جس میں پوری انسانیت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ (سورۃ الحجرات: ۱۳)

(ترجمہ) اے انسانو! بے شک ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت کے جوڑے سے پیدا کیا، اور تمھیں قومیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ یقیناً تم میں سے اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کون سی بات اپنی موزونیت اور محلِ استعمال میں اتنی آفاقی ہو سکتی ہے؟ کیا یہ ایک ایسا پیغام نہیں، جو اِس دُنیا اور اُس دُنیا (آخرت) میں پوری روحانی اور انسانی مخلوقات کے نام ہے؟

حوالے

۱۔ ٹی ایزوتسو : IZUTSU

The Structure of the Ethical Terms in the Quran

مطبوعہ ٹوکیو ۱۹۵۹ء۔ اور

God and Man in the Quran مطبوعہ ٹوکیو ۱۹۶۴ء

۲۔ ایضاً God and Man in the Quran، صفحہ ۲۳۴

۳۔ دیکھیے لین (LANE) / Lexicon، صفحہ ۳۰۹۔ نیز دیکھیے المحاسبی: الرعایہ لحقوق اللہ، مرتبہ حلیم محمود و احمد عطا، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۷۰ء، ص ۳۱۔

۴ - الکشّاف، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۴ء، ص ۴۳ -
۵ - زُہیر : مُعلّقہ، ج ۳۶ -
۶ - ایضاً : معلّقہ، ج ۵۱ -
۷ - لین : Lexicon، ص ۱۸ -
۸ - عمرو بن کلثوم : مُعلّقہ، ج ۴۲ -
۹ - شرح دیوان الحماسہ، مولانا اعزاز علی، مطبوعہ دہلی (تاریخ ندارد) -

---

(یہ مقالہ "قرآن، چودہ صدیوں میں" کے موضوع پر کینبرا میں بین الاقوامی کانفرنس میں پیش کیا گیا جو آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۸ تا ۱۳ مئی ۱۹۸۰ء منعقد ہوئی - ملاحظہ ہو "ہمدرد اسلامیکس"، جلد ۳، نمبر ۳، ۱۹۸۰، کراچی، یہ مقالہ آسٹریلیا کی نیشنل یونیورسٹی میں مذکور منعقدہ مذاکرہ سے متعلق کتاب میں بھی شائع ہو چکا ہے -)